لباس کا مسئلہ

اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے

[اشاعت گذشتہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ اس موضوع پر میرا ایک مضمون یہاں نقل کیا جائیگا جو رسالۂ معارف بابت دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب جو پورے دس سال کے بعد اس پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت کچھ حذف و اضافہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ مضمون یہاں ترمیم شدہ صورت میں پیش کیا جارہا ہے]

اگر تمدن کے پیدا کردہ زوائد سے الگ کر کے لباس کو محض اُس فطری احتیاج کے لحاظ سے دیکھا جائے جس نے اول اول انسان کو اسکے اختیار کرنے پر اُکسایا تھا، تو وہ صرف ایک ایسی چیز ہے جو شرم و حیا کے فطری جذبات کے تحت جسم کے خاص حصوں کو چھپائے، اور موسمی اثرات سے اسکو محفوظ کرے۔ اپنی سادہ صورت میں ایسا لباس جو اِن دو ضرورتوں کو پورا کرتا ہو، قریب قریب ایک ہی وضع کا ہونا چاہیے، کیونکہ سب انسانوں کے جسم ایک سے ہیں، اور انکو چھپانے کی آسان اور متبادر صورتیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ موسموں کے اختلاف کی بنا پر اُن کی صورتوں میں اتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ جہاں گرمی ہو وہاں کے لباس ہلکے اور کم حصۂ جسم پر حاوی ہوں، اور جہاں سردی ہو وہاں کے لباس بھاری اور زیادہ حصۂ جسم پر چھائے ہوئے ہوں۔

قدیم ترین انسانوں کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، اُن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لباس جس زمانہ میں محض فطرت کے ابتدائی اقتضا، اور مجرد انسانی ضروریات پر مبنی تھا، اس وقت اُسکی صورتوں میں کچھ بہت زیادہ تنوع نہ تھا، اور جو کچھ تھا بھی تو وہ زیادہ تر موسمی اثرات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب انسان کے شعور نے ترقی

کی، تہذیب کی طرف قدم بڑھایا، صنعتیں پیدا ہوئیں، نئے نئے وسائل دریافت کیے گئے، اور اس فطری ملکہ نے انسان کے مزاج میں نشو و نما پایا جسے "مذاق" کہتے ہیں، تو رفتہ رفتہ فطرت کی ابتدائی ضروریات پر کچھ اور چیزوں کا اضافہ ہونے لگا۔ یہ نئے آنے والے اثرات چونکہ مختلف قوموں میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف تھے، اسلیے مختلف قوموں نے ابتدائی فطری لباس پر جو اضافے کیے وہ بھی اپنی صورتوں اور کیفیتوں کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہی ہونے چاہییے تھے، اور فی الواقع مختلف ہوئے۔

مختلف قوموں میں لباس کی مختلف وضعوں کی پیدائش اور پھر ان کا تغیر و تبدل اور نشو و ارتقاء جن بے شمار چھوٹے بڑے اسباب کے زیر اثر ہوتا ہے، ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہزارہا سال کے دوران میں قوموں کی اجتماعی زندگی اور ہر قوم کے افراد کی شخصی زندگی بے حد و حساب خارجی و داخلی تاثیرات سے متاثر ہوتی ہے جن کا ریکارڈ کہیں محفوظ نہیں رہتا، بلکہ بہت سے اثرات تو ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتے۔ لیکن جزئیات سے قطع نظر کرکے اگر ہم ان بڑے بڑے عوامل کا استقصاء کریں جنکے اثر سے مختلف قوموں میں مختلف طرزوں کے لباس رواج پاتے ہیں، تو وہ حسب ذیل آٹھ عنوانات کے تحت تقسیم کیے جا سکتے ہیں :۔

(۱) جغرافی حالات جو ایک ملک کے باشندوں کو ایک خاص قسم کا لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

(۲) اخلاقی و مذہبی تصورات، جنکے اختلاف کی وجہ سے مختلف قوموں میں عورتوں اور مردوں کے لباس مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔

(۳) فطری مذاق، جس کا نشو و نما ہر قوم میں مختلف اثرات کے تحت مختلف طور پر ہوتا ہے، اور اسی اختلاف مذاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کی پسند دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

(۴) طرز معاشرت، جو ہر قوم کے مخصوص جغرافی، تمدنی، معاشی اور عقلی و اخلاقی حالات کے تحت ایک مخصوص صورت میں نشو و نما پاتا ہے، اور ہر قوم فطرۃً اسی وضع کا لباس اختیار کرتی ہے جو اس کے عام طرز معاشرت

سے مناسبت رکھتا ہو۔

(۵) معاشی حالت، جس کے تحت ایک قوم کے عام ذرائع کسب معیشت، اسکے پیشے، اسکی صنعتیں، اور اسکی مالی حالت (افلاس یا خوشحالی) سب چیزیں آجاتی ہیں۔ ہر قوم کا لباس لازمی طور پر اس کے اِن حالات کے مطابق ہوتا ہے اور اُن کے تغیر کے ساتھ ساتھ فطرۃً لباس میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔

(۶) تہذیب و شائستگی، جس میں ہر قوم ایک خاص مرتبے پر ہوتی ہے اور اس کا قومی لباس لازماً اسکی تہذیب و شائستگی کے معیار کا ساتھ دیتا ہے۔

(۷) قومی روایات، جن کے تحت ایک نسل اپنے بزرگوں سے ایک خاص قسم کا طرزِ زندگی اور طرزِ لباس وراثت میں پاتی ہے، اور تھوڑا بہت تغیر و تبدل کرکے اپنے بعد کی نسل کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ مظاہر زندگی کا یہ تسلسل درحقیقت قومی وجود کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے، اسلیے ہر قوم فطرۃً اسکو عزیز رکھتی ہے۔

(۸) بیرونی اثرات، جو ہر قوم کے خیالات اور طرزِ زندگی پر دوسری قوموں کے میل جول سے پڑتے ہیں، مگر یہ امر کہ ایک قوم کس حد تک اور کس طرح دوسروں سے اثر پذیر ہوتی ہے، بڑی حد تک اس کے سیاسی، اور ذہنی و اخلاقی حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

یہ وہ بڑے بڑے عوامل ہیں جو ایک قوم کے لباس، اور صرف لباس ہی نہیں بلکہ اسکی پوری اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اقتدار رکھتے ہیں اور ہر قوم کا لباس انہی کے مشترک عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس تجزیہ کی مدد سے جب ہم قومی لباس کے مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دو بنیادی حقیقتیں ہمارے ہاتھ آتی ہیں:

ایک یہ کہ لباس محض ایک بیرونی آلۂ ستر پوشی اور اوپری ذریعۂ حفاظتِ جسم ہی نہیں ہے بلکہ قومی نفسیات، قومی تہذیب و تمدن، قومی روایات، اور قوم کی اجتماعی حالت کے اندر بہت گہری جڑیں رکھتا ہے وہ دراصل اس روح کا مظہر اور ذریعۂ نمود ہے جو جسم قومی میں کارفرما ہوتی ہے۔ ہر قوم کا لباس درحقیقت ایک زبان ہے جسکے ذریعہ سے اسکی قومیت کلام کرتی ہے اور دنیا کو اپنی اجتماعی معنویت سے روشناس کراتی ہے۔

دوسرے یہ کہ لباس کی تہ میں جتنے عوامل کارفرما ہیں، جغرافی حالات کے سوا باقی سب ایسے ہیں جو ہر قوم میں ہر آن ایک غیر محسوس رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ساکن و جامد نہیں ہے، بلکہ ہر ایک فطرۃً تغیر پذیر ہے۔ اور ان کا تغیر و ارتقار لازمی طور پر صرف لباس ہی پر نہیں بلکہ پوری قومی زندگی پر آہستہ آہستہ اثرانداز ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترقی کرنے والی قوم میں جب علوم و فنون پھیلتے ہیں، خیالات میں روشنی آتی ہے، صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوتا ہے، معاشی حیثیت سے خوشحالی بڑھتی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملتا ہے، اور ان کے اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن سے اسکو مختلف قسم کے سبق حاصل ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر خود بخود اسکی اجتماعی زندگی میں ایک ارتقائی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبات بدلتے ہیں، فطری مذاق سدھرتا ہے، طرز معاشرت میں خوبی و نفاست آجاتی ہے، شائستگی کا معیار بلند ہوتا ہے، نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، قومی روایات کا احترام زیادہ ستھری شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام شعبوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی لباس بھی مادہ و صورت دونوں کے اعتبار سے زیادہ حسین، زیادہ خوش وضع اور زیادہ شائستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس ارتقائی عمل کی کسی منزل میں بھی اسکی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ساری قوم کے لیے لباس کی کوئی خاص تراش مقرر کرنے یا کسی خاص طرز لباس کو رائج کر دینے کی زحمت اٹھائی جائے، بلکہ اجتماعی عوامل کی مشترک گردش کے اثر سے خود بخود پرانے اوضاع لباس میں اصلاحیں ہوتی جاتی ہیں، نئی نئی وضعیں چل نکلتی ہیں، اور مجموعی حیثیت سے پوری قوم کا مذاق و مزاج اپنی افتاد و پرداز کے مطابق لباس کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔

قومی لباس کی پیدائش، اسکے تغیر و تبدل اور اس کے نشو و ارتقار کی فطری صورت یہی ہے۔ اور اس کے برعکس غیر فطری یا مصنوعی صورت یہ ہے کہ ایک قوم کا لباس بتکلف بدلوایا جائے اور کسی دوسری قوم سے اس کا لباس مانگ لایا جائے۔ جہاں تک نفس تغیر کا تعلق ہے، وہ فطری ارتقار کی صورت میں بھی

ہوتا ہے اور غیر فطری انقلاب کی صورت میں بھی۔ مگر دونوں قسموں کے تغیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت کا نشوونما، کہ وہ جتنا جتنا بڑھتا ہے، اسکے رنگ روپ، جسامت، پھول پھل، پتیوں اور شاخوں میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں، مگر ان تمام تغیرات کے باوجود درخت کی خودی جوں کی توں رہتی ہے۔ املی کا درخت ہے تو آخر وقت تک املی کا ہی درخت رہیگا، اور آم کا درخت ہے تو ارتقار کے ہر درجہ میں اسکی آمیت بدستور قائم رہیگی۔ زمین، ہوا، پانی، گرمی، دھوپ، ہر ایک چیز سے وہ بہت کچھ لیگا، مگر جو کچھ بھی لیگا اسے اپنی خودی کا جز بنا لیگا۔ بخلاف اسکے دوسری قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت چلا تو تھا املی ہونے کی حیثیت سے مگر یکایک اس پر آم کی چھال لا کر چپکا دی گئی اور آم ہی کی شاخیں اور پتیاں اس پر جڑ دی گئیں۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ عجوبہ فی الحقیقت ہے کیا۔ آم ہے کہ املی؟ اس طرح کے مصنوعی اور جعلی تغیرات سے فی الواقع کوئی حقیقی اور نتیجہ خیز تغیر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ فطری ارتقار کے راستہ میں الٹا خلل واقع ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ اجتماعی مسائل میں کوئی بصیرت نہیں رکھتے اور محض سطحی نظر سے زندگی کے معاملات کو دیکھتے ہیں، وہ بچوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ یہ خیال کرتے ہیں کہ لباس اور طرزِ معاشرت کی کچھ ظاہری شکلوں کے بدل دینے سے ایک قوم فی الحقیقت بدل جاتی ہے۔

عموماً تغیر لباس کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سے ایک پس ماندہ قوم کی ذہنیت بدلتی ہے۔ سکون و جمود کی جگہ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ تنزل و انحطاط کے دور کا لباس آتارتے ہی وہ تمام اندرونی کمزوریاں جو اس دور کے ساتھ مختص تھیں، اور وہ ساری دلچسپیاں جو اس دور کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں یکایک کافور کی طرح اڑ جاتی ہیں، اور نیا لباس پہنتے ہی، خصوصاً جبکہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے لیا گیا ہو، قوم کے نفسیات اور اسکی زندگی میں ایک آنی اور دفعی تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس میں خود بخود ترقی یافتہ ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آگے بڑھی ہوئی قوموں کے برابر سمجھنے لگتی ہے۔ دوسری قومیں بھی اس کو اپنے برابر کا سمجھنے لگتی ہیں۔ اور جب وہ ترقی یافتہ قوموں کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیتی ہے تو اس میں انہی جیسی

شائستگی عملی سرگرمی اور فعلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ مہذب اور کارکن قوموں میں جو لباس اور طرز زندگی پیدا ہوا ہے اسے اختیار کرنا مہذب اور کارکن بننے کے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی ــــ یہ اور اسی قسم کے بہت سے دلائل اس فعل کی تائید میں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب محض سطحی تخیلات ہیں جنکی تہ میں کوئی تفکر اور کوئی بصیرت نہیں ہے۔ پھر ان خیالات کی سند میں بعض بڑی بڑی نامور شخصیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں، اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان شخصیتوں کے نام سنتے ہی آدمی پر ہول طاری ہو جائیگا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن کی سند پیش کی جاتی ہے فکر و بصیرت کے اعتبار سے ان کا درجہ بھی ان لوگوں سے کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے جو انکی سند پیش کرتے ہیں۔ اپنے متبعین کی طرح وہ بیچارے خود بھی فکری حیثیت سے سطحی ہیں اور علمی حیثیت سے کم مایہ ہیں۔ ہنگامی حالات میں کامیاب تدبیریں اختیار کر کے اگر کسی نے اپنی قوم کو تباہی سے بچا لیا ہو تو بلاشبہ وہ قدر و عزت کا مستحق ہے، مگر اسکی قدر اتنی ہی کی جاسکتی ہے جتنا وہ فی الواقع ہے، اور اسی حیثیت سے کی جاسکتی ہے جس حیثیت سے اس نے کارنمایاں انجام دیا ہے۔ اسکے حقیقی مرتبہ سے آگے بڑھا کر اسے فکری رہنما کی حیثیت دینا ایسی ہی بے عقلی ہے جیسے کسی اچھے انجنیر نے اگر سیلاب کے آگے بند باندھ کر کسی بستی کو تباہی سے بچا لیا ہو تو اسے ہر معنی میں بر اعظم اور نجات دہندہ سمجھ لیا جائے اور کہا جائے کہ اب محکمہ حفظان صحت کا نگراں بھی اُسی کو بنا دو اور تعلیمات کی نگرانی بھی اُسی کے سپرد کر دو۔

اصولی حیثیت سے جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے وہ تغیر پسند حضرات کے دلائل کی غلطی واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن زمانے کی روش کے اثر سے جو غلط فہمیاں عام طور پر دماغوں میں گھر کر چکی ہیں ان کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسکے خلاف میں اپنے دلائل زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کروں:

(۱) پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ لباس کی وضع قطع بجائے خود کوئی مستقل بالذات چیز نہیں ہے بلکہ بہت سے قدرتی اور اجتماعی عوامل کے مشترک عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان

عوامل کے عمل سے کسی قوم میں جو خاص وضع لباس پیدا ہوئی ہو وہی اسکی فطری وضع ہے اُس کو ترک کر کے یکایک کوئی ایسی نئی وضع اختیار کر لینا جو مناسب طور پر ان عوامل کے مشترک عمل سے نہ پیدا ہوئی ہو بالکل خلاف وضع فطری ہے۔

(۲) ایک قوم کے لباس کا نہایت قریبی تعلق اسکے طرز معاشرت سے ہوتا ہے، اور اس کا طرز معاشرت اسکی پوری تمدنی زندگی سے کئی طرح کے روابط اور مناسبتیں رکھتا ہے۔ لباس و طرز معاشرت کے فطری تغیرات میں تو یہ تمام مناسبتیں برقرار رہتی ہیں، کیونکہ اس صورت میں زندگی اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بحیثیت مجموعی حرکت کرتی ہے۔ لیکن اگر غیر فطری طریقہ پر تکلف اور تصنع کے ساتھ لباس و طرز معاشرت کو بدل دیا جائے، یا صرف لباس میں تغیر کر دیا جائے تو ساری اجتماعی زندگی میں ایک برہمی و بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلیے کہ زندگی کے دوسرے شعبے اس تغیر کا ساتھ نہیں دیتے اور ایک دوسرے سے بے جوڑ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) لباس کا شائستہ و خوبصورت اور ترقی یافتہ حالات کے مناسب ہونا دراصل اس پر منحصر ہے کہ قوم خود اجتماعی حیثیت سے ترقی کرے اور ایک شائستہ، متمدن، خوش مذاق، روشن خیال اور عملی قوم بن جائے۔ اس راہ میں وہ جتنی جتنی آگے بڑھتی جائیگی اسی نسبت سے اس کے قومی لباس میں خود بخود اصلاح ہوتی جائیگی۔ ترقی پذیر نفس اجتماعی آپ سے آپ خالص فطری طریقے سے بلا ارادہ اور بلا تکلف کچھ اپنی پرانی چیزوں میں ترمیم و اصلاح کریگا اور کچھ دوسروں کی مناسب چیزیں لے کر اپنے ہاں اس طرح سجالیگا کہ وہ موزونیت کے ساتھ اس میں کھپ جائینگی۔ اصلاح و ترقی میں پیش قدمی کے اس فطری طریقے کو چھوڑ کر آنِ واحد میں ایک لباس کی جگہ دوسرا لباس بدل لینا ایسا ہی ہے جیسے چھلانگ مار کر ایک حالت سے دوسری حالت میں پہنچ جانے کی کوشش کی جائے۔ اجتماعی زندگی میں اس قسم کی چھلانگیں مارنے سے کوئی حقیقی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

(۴) کسی قوم کی اجتماعی حالت کے ترقی کرنے سے پہلے اس کے لباس و معاشرت کو بلند کرنا اور اسے کسی ایسے مرتبے پر لے جانے کی کوشش کرنا جو اسکے حقیقی اجتماعی مرتبہ سے اونچا ہو، بالکل ایسا ہے جیسے کسی نابالغ بچے کو ہیجان خیز ماحول میں رکھ کر، گرم گرم غذائیں اور تیز دوائیں کھلا کر زبردستی حدِ بلوغ کو پہنچایا جائے۔ اس طرح کی غیر معمولی "تبلیغ" سے اس غریب بچے کے نظام جسمانی و احوال ذہنی میں جو شدید اختلال برپا ہوگا، اسی پر اُس برہمی و ابتری کو قیاس کر لینا چاہیے جو زبردستی "مہذب و شائستہ" بنائے جانے سے کسی قوم کے اجتماعی نظام اور اسکی ذہنی و اخلاقی حالت میں برپا ہوگی۔

(۵) ایک قوم کی معاشی حالت جس طرزِ لباس و معاشرت کا بار برداشت کر سکتی ہو اس سے زیادہ بھاری لباس و معاشرت کا بوجھ اس پر لاد دینا اسے عملاً تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ لباس و معاشرت کے ساتھ وہ خوشحال قوموں کے دوسرے تمدنی ڈھنگ اختیار کرنے کی بھی کوشش کریگی، اور اسکے نتائج اسکے حق میں تباہ کن ہونگے۔

(۶) لباس زبان اور رسم الخط وہ اولین چیزیں ہیں جنکے سہارے ایک قوم کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی قومیت کے ان سہاروں کو گرا دیا جائے تو اسکی انفرادیت آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی ہے اور آخر کار وہ دوسری قوموں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدیم زمانہ کی وہ قومیں جو آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہیں، اور جنہیں ہم امم بائدہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، سب کی سب اسی وجہ سے فنا ہوئیں۔ ان کے فنا ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اشخاص جن پر وہ قومیں مشتمل تھیں، سب مٹ گئے اور کوئی نسل دنیا میں چھوڑ کر نہیں گئے۔ بلکہ دراصل انکی گمشدگی اور فنائیت اس معنی میں ہے کہ انکی قومی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ انہوں نے اپنی قومیت کے سہاروں کو خود گرا دیا، یا گر جانے دیا۔ ان کے افراد دوسری قوموں کے لباس، زبان، رسم الخط اور آدابِ معاشرت اختیار کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ انکی قومیت مضمحل ہوتے ہوتے ناپید ہو گئی۔ یہی حشر اب بھی ان قوموں کے لیے مقدر ہے جو اپنے نادان لیڈروں کی احمقانہ تدبیروں کو ترقی کا ذریعہ سمجھ

کر قبول کر رہی ہیں۔

(۷) ایک قوم کا دوسری قوم کے لباس و طرزِ معاشرت کو اختیار کرنا دراصل استغفارِ نفس کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے۔ اسکے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، ادنی اور پست سمجھتی ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔ اسکے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کیے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو۔ اس کا قومی مذاق اتنا پست اور اس کا قومی ذہن اتنا کُند ہے، اور اسکے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لیے کوئی بہتر طرزِ زندگی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے آپ کو مہذب دکھلانے کے لیے سب کچھ دوسروں سے مانگ لاتی ہے، اور بغیر کسی شرم کے دنیا کے سامنے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ تہذیب، شائستگی، حضارت اور حسن و جمال جو کچھ بھی ہے دوسروں کی زندگی میں ہے۔ وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سینکڑوں ہزاروں برس کی قومی زندگی میں گویا بس جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر و عزت کے لائق ہو یا زندہ رہنے کی مستحق ہو —— یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خودداری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلت و پستی کا مجسم اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانہ کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس امر پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر و ذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے۔ یا تو اُس وقت جبکہ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہار مان لے اور ڈگیں ڈال دے، مثلاً ہندوستان، ٹرکی، ایران وغیرہ۔ یا پھر اس صورت میں جبکہ فی الواقع اُسکی پُشت پر کسی قسم کی قابلِ فخر روایات (traditions) نہ ہوں، اسکی اپنی کوئی تہذیب و ثقافت پہلے سے نہ رہی ہو، اس میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں، اور وہ اقوامِ عالم کے درمیان محض ایک نو دولتے (upstart) کی حیثیت رکھتی ہو، جیسے جاپان۔

(۸) ایک قوم سے دوسری قوم کو اگر کوئی چیز لینی چاہیے اور کوئی چیز درحقیقت لینے کے قابل ہے

تو وہ محض اسکی علمی تحقیقات کے نتائج، اسکی تخلیقی و اختراعی قوتوں کے ثمرات، اور اسکے وہ عملی طریقے ہیں جن سے اس نے دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسکی تاریخ میں، یا اسکی تنظیمات میں، یا اس کے اخلاقیات میں اگر کوئی مفید سبق ہے تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اسکی ترقی اور کامیابی کے اسباب کا پوری چھان بین کے ساتھ استقصار کرنا چاہیے، اور ایک ایک چیز جو مفید ہو اسے لینا چاہیے۔ یہ چیزیں انسانیت کی مشترک میراث ہیں۔ ان کی قدر نہ کرنا، اور ان کے لینے میں قومی عصبیت کی بنا پر بخل کرنا محض جاہلیت ہے۔ لیکن ان چیزوں کو چھوڑ کر دوسری قوم سے اس کے پہننے کے کپڑے اور اس کے رہنے سہنے کے طریقے اور اس کے کھانے کی چیزیں مانگنا، اور انہی کو ترقی کا ذریعہ سمجھنا، بجز اسکے کہ کند ذہنی کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔ کیا کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یورپ نے کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، ہیٹ اور بوٹ کے ذریعہ سے ترقی کی ہے؟ یا اس کی ترقی کے اسباب یہ ہیں کہ وہ چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہے؟ یا اسکی تزئین و آرائش کے سامان، پاؤڈر اور لپ سٹک اور کاسمیٹکس وغیرہ اسکو اڑا کر ترقی کے آسمان پر لے گئے ہیں؟ یہ بات اگر نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اصلاح و ترقی کا نام لینے والے سب سے پہلے انہی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں؟ کیوں انکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یورپ کی زندگی میں یہ چمک دمک جو نظر آتی ہے یہ دراصل صدیوں کی پیہم جدوجہد کا ثمرہ ہے، اور جو قوم بھی لگاتار محنت اور صبر و عزم کے ساتھ کام کرے اسکی زندگی اسی طرح قابلِ رشک ہو سکتی ہے جس طرح آج یورپ کی زندگی پر رشک کیا جاتا ہے؟

ان دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا کسی دوسری قوم کے لباس و معاشرت کو اختیار کرنا ایک غیر طبعی اور غیر معقول حالت ہے اور اس میں کسی پہلو سے بھی کوئی معقولیت نہیں ہے۔ معمولی حالات میں کوئی شخص یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکتا کہ اسکے گرد و پیش جو عام طریق زندگی پہلے سے رائج ہے اسے وہ کیوں چھوڑ دے اور کیوں اسکی جگہ اجنبی لوگوں کا طریقِ زندگی اختیار کرے۔ اس قسم کے خیالات

ہمیشہ غیر معمولی حالات (Abnormal conditions) ہی میں پیدا ہوا کرتے ہیں، اور انکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے زمانۂ حمل میں بعض عورتیں مٹی کھانے لگتی ہیں یا جب آنکھ کی ساخت میں خرابی آجاتی ہے تو آدمی ہر چیز کو ٹیڑھا دیکھنے لگتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خالص اجتماعی نقطۂ نظر سے تھا۔ اب ہم شریعت اسلام کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر ایک نگاہ ڈالینگے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ہر معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو عقل عام اور فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ آپ رنگین عینکیں اتار کر صاف نگاہ سے معاملات کو انکی حقیقی و فطری صورت میں دیکھیے۔ اس طرح کے مشاہدہ سے جس نتیجہ پر آپ پہنچینگے وہ بعینہٖ وہی نتیجہ ہوگا جس پر اسلام پہنچا ہے۔ وہ کوئی خاص لباس اور کوئی خاص طرز زندگی انسان کے لیے مقرر نہیں کرتا، بلکہ فطری طور پر جس جس طرز زندگی اور وضع لباس نے نشو و نما پایا ہے، اس کو جوں کا توں تسلیم کر لیتا ہے۔ البتہ خالص اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے وہ چند اصول مقرر کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے قومی لباس و طرز معاشرت میں ان اصولوں کے مطابق اصلاح کرلے۔

ان میں سب سے پہلی چیز ستر کے حدود ہیں۔ اخلاق کے نقطۂ نظر سے اسلام اسکو ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مرد خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں لازمی طور پر اپنے جسم کے ان حصوں کو چھپائیں جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہیں۔ اور تمام عورتیں خواہ وہ زمین کے کسی خطہ میں رہتی ہوں، چہرے اور ہاتھ پاؤں کے سوا اپنے پورے جسم کو مستور رکھیں[1]۔ اگر کسی قوم کی وضع لباس ایسی ہو کہ ستر کی یہ شرطیں اس میں پوری نہ ہوتی

---

[1] یہ واضح رہے کہ عورت کے لیے یہ ستر کے حدود ہیں، نہ کہ حجاب کے۔ ستر وہ چیز ہے جسے عورت کو اپنے شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانا چاہیے، خواہ وہ اسکا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور حجاب اس سے زائد ایک چیز کا نام ہے جس میں قریبی رشتہ داروں اور غیر مردوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنی خانگی زندگی کے حدود سے باہر اپنے حسن اور اپنی آرائش کی نمائش کرتی پھریں۔

ہوں تو اسلام اس سے مطالبہ کریگا کہ اپنی وضع میں ان خسرطوں کے مطابق اصلاح کرے - اور جب وہ اصلاح کریگی تو اسلام کا منشار پورا ہو جائیگا۔ پھر اسکو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس تراش خراش کا لباس پہنتی ہے -

دوسری ضروری اصلاح جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہننا چھوڑ دیں - اور مرد اور عورتیں سب ایسے لباس پہننے سے احتراز کریں جن سے فخر و غرور، بے جا نمائش، اور عیش پسندی کا اظہار ہوتا ہو - وہ تکبر کے لباس جو زمین پر لٹکتے ہوئے چلتے ہیں، اور جنہیں پہن کر ایک انسان دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی جتاتا ہے، اسلام کی نظر میں لعنت کے قابل ہیں - وہ فخر و ریار کے لباس جنہیں پہن کر ایک طبقہ کے لوگ عام انسانوں پر اپنی شان اور ترفع کا رعب جمانے ہیں اور اپنی خوشحالی کی نمائش کرتے ہیں، اسلام کے نزدیک حرام ہیں - وہ بھڑکیلے لباس بھی اسلام کو پسند نہیں جنکے اندر نفس پرستی اور عیاشی کی پرورش ہوتی ہے - ان چیزوں کو اپنی پوشش سے خارج کر دیجیے - پھر آپ کے لیے وہی وضع لباس اسلامی وضع ہے جو آپ کے ملک میں رائج ہو، یا آپ کی سوسائٹی میں مستعمل ہو -

تیسری چیز جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شرک اور بت پرستی کی وہ مخصوص علامتیں جنہیں کسی مذہبی فرقے نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہو، آپ کے لباس سے خارج ہو جانی چاہییں - مثلاً زنار، صلیب، تصویریں، یا ایسی ہی دوسری چیزیں جو غیر اسلامی شعائر کی تعریف میں آتی ہوں -

ان اخلاقی و تمدنی اصلاحات کے ساتھ ہر ملک اور ہر قوم کا لباس تقویٰ اور شائستگی کے اس معیار پر آجاتا ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے - مگر اس کے ساتھ ہی اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے لباس میں کوئی ایسی امتیازی چیز ضرور ہو جس سے وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں ممیز ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ غیر مسلموں میں خلط ملط نہ ہو جائیں اور ایک دوسرے کو پہچان سکیں، اور ان کے درمیان جماعتی زندگی مستحکم ہو سکے - اس غرض کے لیے اسلام نے کوئی خاص وضع یا علامت مقرر نہیں کی ہے، بلکہ اسے عرف عام پر چھوڑ دیا ہے - عرب میں جب اسلامی تحریک کا آغاز ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان وہی لباس پہنتے تھے

جو عرب کا عام قومی لباس تھا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کو مشرکین عرب سے ممتاز کرنے کے لیے یہ علامت تجویز فرمادی تھی کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ باندھیں[۱]۔ عام عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے یا صرف عمامہ ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کے لیے وجہ امتیاز بن گیا، اور اتنے امتیاز کو اس غرض کے لیے کافی سمجھا گیا کہ اس نئی تحریک کے پیرو اپنے ملک کے عام باشندوں سے الگ پہچانے جاسکیں۔ بعد میں جب تمام عرب مسلمان ہوگیا تو اس علامت کی حاجت باقی نہ رہی، کیونکہ اب عربی لباس ہی اسلامی لباس بن گیا تھا، اور اس لباس کو پہننے والا کوئی شخص کافر و مشرک نہ رہا تھا کہ اسے مسلمانوں سے ممیز کرنے کے لیے کسی امتیازی نشان کی حاجت ہوتی۔ اسی طرح جب ایران اور دوسرے ممالک میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو اول اول اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ نومسلم یا تو عربی لباس پہنیں یا اپنے پرانے ملکی لباس میں کسی خاص علامت (مثلاً عمامہ یا خاص طرز کی عبا) کا اضافہ کرلیں، کیونکہ اس وقت ان کا ملکی لباس غیر مسلموں کا لباس تھا، اور بغیر کسی شان امتیاز کے اس کو استعمال کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کسی طرح نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جب ان ممالک کے سارے باشندے مسلمان ہوگئے، اور انکے ملکی لباس میں وہ اخلاقی و تمدنی اصلاحات نافذ کردی گئیں جنکا اوپر ذکر ہوا ہے، تو انکے مختلف مقامی لباس بعینہٖ اسلامی لباس بن گئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی جن ممالک کے تمام یا اکثر باشندے مسلمان ہو چکے ہیں اُن کے ملکی لباس اپنی مختلف وضعوں کے باوجود سب کے سب اسلامی لباس ہیں۔ اور جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مخلوط ہے، وہاں ہر وہ لباس اسلامی لباس ہے جسے پہن کر ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم میں تمیز ہو سکے۔ اور جہاں کی ساری آبادی غیر مسلم ہے وہاں ہر اس شخص کے لیے جو اسلام قبول کرے، یہ ضروری ہے کہ عام غیر مسلموں سے ممتاز ہونے کے لیے اپنی وضع میں کسی ایسی علامت کا اضافہ کرے جو عموماً اسلامی نشان کی حیثیت سے معروف ہو۔

---

[۱] ابو داؤد، ترمذی اور مستدرک میں یہ روایت آئی ہے کہ حضور نے فرمایا فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس یعنی "ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق کرنے والی چیز ٹوپی پر عمامہ باندھنا ہے"۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے دائمی قانون ہے۔ چنانچہ اب بھی بعض لوگ اس فعل کو مسنون قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ محض بے سمجھے حدیث پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ دراصل مسنون صرف یہ ہے کہ جب مسلمان کسی ایسی قوم میں ہو جسکے اکثر افراد غیر مسلم ہوں تو وہ اپنے لباس میں اپنے آپ کو الگ کوئی امتیازی نشان پیدا کرلے۔

تشبّہ

اس مرحلہ پر پہنچ کر ہمارے سامنے تشبّہ کا مسئلہ آجاتا ہے۔ تشبّہ کے معنی ہیں کسی کے مشابہ بننا۔ اور اس معنی کے لحاظ سے تشبّہ کی چار صورتیں ممکن ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کے رویّہ کی توضیح یہاں کی جاتی ہے:

(۱) صنفی تشبّہ، یعنی مرد کا عورت کے مانند بننا یا عورت کا مرد کے مانند بننا۔ یہ فعل چونکہ فطرت سے انحراف ہے، اور ایک بگڑی ہوئی ذہنیت کی علامت ہے، اسلیے اسلام اسے ملعون قرار دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مردوں پر جو زنانہ لباس پہنیں اور ان عورتوں پر جو مردانہ لباس پہنیں صاف الفاظ میں لعنت فرمائی ہے اور یقیناً ہر وہ شخص جسکا ذہن صحیح و سلیم ہوگا اس معاملہ میں وہی نقطۂ نظر اختیار کریگا جو اللہ کے نبی کا نقطۂ نظر ہے۔ مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانہ پن، خواہ کسی حیثیت سے بھی ہو، ایک نفرت انگیز چیز ہے جسے دیکھ کر طبیعت بے اختیار بغاوت کرتی ہے۔

(۲) قومی تشبّہ، یعنی ایک قوم کا بحیثیت مجموعی کسی دوسری قوم کی وضع اختیار کر لینا۔ یہ چیز بھی غیر طبعی اور غیر معقول ہے، اور ہمیشہ ان حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کسی قوم میں دنارت کی وبائے عام پھوٹ پڑی ہو، لہٰذا اسلام اسکو بھی جائز نہیں رکھتا۔ صحابۂ کرام کے دور میں قومی تشبّہ کی جس طرح روک تھام کی گئی تھی، اور مفتوح ممالک کے باشندوں کو عربیت اختیار کرنے سے جس سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا اس سے صحیح اسلامی روح کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) انفرادی تشبّہ، یعنی کسی قوم کے بعض افراد کا کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا۔ یہ دراصل انفرادی سیرت کی کمزوری کا نشان ہے۔ جو افراد اس قسم کی روش اختیار کرتے ہیں وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ انکے نفس میں تلوّن کی بیماری موجود ہے۔ انکی سیرت میں پختگی اور استحکام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سیال مادّہ کی طرح ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ رہتا ہے۔ علاوہ بریں اخلاقی حیثیت سے یہ ایک مکروہ فعل ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا نسب کسی دوسرے سے ملائے۔ جس طرح وہ قابل ملامت ہے، اسلیے کہ اپنی اس حرکت سے دراصل وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے حقیقی باپ کی اولاد ہونے

کو وہ باعث ننگ سمجھ رہا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی قابل ملامت ہے جو پیدا تو ایک قوم میں ہو، مگر عزت وافتخار حاصل کرنے کے لیے وضع دوسری قوم کی اختیار کرے، کیونکہ اس طرح وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ جس قوم نے اسے جنم دیا ہے اس سے وابستہ ہونا اسکی نگاہ میں موجب عار ہے اور اسکے نزدیک عزت کی شکل صرف یہ ہے کہ اسکا شمار دوسری قوم میں ہو۔ تمدنی حیثیت سے بھی یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ جو لوگ اسے اختیار کرتے ہیں وہ چمگادڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ نہ اُس قوم کے رہتے ہیں جس میں پیدا ہوئے ہیں، اور نہ اس قوم کے بن سکتے ہیں جسکے بننا چاہتے ہیں۔ لا الی ھٰؤلاء ولا الی ھٰؤلاء۔ انہی وجوہ سے صحابۂ کرام اور خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے عرب کے اُن افراد کو زجر و توبیخ کی تھی جو بیرونی ممالک میں جاکر عرب کے بدوی لباس چھوڑ بیٹھے تھے اور روم و ایران کے شاندار تمدن سے مرعوب ہو کر ان کے لباس اختیار کر لیتے تھے۔

(۴) تشبّہ بالکفار، یعنی کسی مسلمان کا غیر مسلم کے مشابہ بننا۔ یہ فعل مسلمانوں کی جماعتی وحدت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسکی وجہ سے مسلمان اور مسلمان کے درمیان اجنبیت پیدا ہوتی ہے اور ان کے باہمی تعلقات میں وہ تعاون و تناصر نہیں ہو سکتا جو اسلام چاہتا ہے کہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ ایک شخص مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلموں کی طرف میلان طبع رکھتا ہے۔ اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ حرکت مضر ہے کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کے مانند بنا ہوا ہے اسکے ساتھ مسلمان ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلموں کا سا معاملہ کرینگے۔ ان وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس قسم کے تشبّہ کی ممانعت فرمائی ہے۔ خالفوا المشرکین۔ خالفوا الیھود والنصاریٰ۔ خالفوا المجوس۔ یہ الفاظ متعدد احادیث میں ہم کو ملتے ہیں جن سے حضورؐ کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان، مسلمان کو دیکھ کر پہچان سکے اور اسکے ساتھ مسلمان کا سا معاملہ کر سکے۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرما دیا تھا کہ جو مسلمان غیر مسلموں میں مخلوط ہو کر رہیگا، میں اس سے بری الذمہ ہوں، یعنی اگر کسی جنگ میں مسلمان اسے دشمن کا آدمی سمجھ کر قتل کر دیں تو اپنے خون کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کا منشا بھی یہی تھا کہ جو شخص کسی قوم کے مشابہ بن کر رہیگا وہ لامحالہ اُسی کا فرد سمجھا جائیگا اور اسکے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائیگا جو اس قوم کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔